JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 42, Issue No.01

TITLE OF THE PAPER

جیلانی بانو کی ناول نگاری کا نفسیاتی مطالعہ

AUTHOR(S)

* **Neelum Ambreen**
Ph.D Scholar, Department of Urdu
National College of Business Administration & Economics, Multan

** **Dr. Rafia Malik**
Assistant Professor, Department of Urdu,
National College of Business Administration & Economics, Multan

CONTACT

* neelamambreen4@gmail.com
** rafiamalik7151@gmail.com

HISTORY OF THE PAPER

Received on:	May	02, 2026
Accepted on:	June	24, 2026
Published on:	June	30, 2026

DETAIL(S)

Volume No. 42, Issue No. 01, Page No: 44-56
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

COPYRIGHT

©The author(s) 2026. ©Journal of Research (Urdu) 2026.
This publication is an open access article.

JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Asif
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 333 6062921

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
muhammadasif12@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 42, Issue No. 1, June 2026

* نیلم امبرین ** ڈاکٹر رافعہ ملک

جیلانی بانو کی ناول نگاری کا نفسیاتی مطالعہ

A psychological study of Jilani Bano's novel writing

ABSTRACT

The fiction of Jilani Bano holds a distinctive place in Urdu literature, marked by a profound engagement with both social realities and human psychology. Her novels present an intricate exploration of inner conflict, feelings of deprivation, class oppression, and the psychological struggles of women. This study offers a psychological analysis of her selected novels, focusing on the inner behavior of characters, unconscious motivations, and the impact of societal pressures on individual identity. Her female characters, in particular, reflect emotional fragmentation, identity crises, and psychological exploitation, revealing the complexities of the human mind. By applying principles of psychological criticism, the study demonstrates that Jilani Bano is not only a sensitive novelist but also possesses a deep understanding of human psychology, which adds lasting significance to her literary work.

KEYWORDS

Jilani Bano, Urdu Novel, Psychological Criticism, Characterization, Inner Conflict, Feminine Consciousness, Unconscious Mind, Social Oppression, Sense of Deprivation, Identity Crisis

جیلانی بانو بیسویں صدی کی ایک نامور فکشن نگار ہیں۔ان کا تعلق اترپردیش کے علاقہ بدایوں سے تھا لیکن ملازمت کے سلسلے میں ان کے والد حیرت بدایونی نے حیدر آباد میں سکونت اختیار کی اور یوں یہ شہر ان کی شہرت کا باعث بنا۔جیلانی بانو نے اپنا بچپن حیدر آباد میں گزارا ان کا خاندان ادبی ذوق رکھتا تھا جس کے اثرات ان کی شخصیت پر اثرانداز ہوئے۔جیلانی بانو رقمطراز ہیں:

"ہم سات بہن بھائی ہیں پھر ان کی سہیلیاں اور دوست ملا کر پوری بٹالین بنا لیتے سب کو غیر

معمولی اور فنکارانہ کام کرنے کا بہت شوق تھا اس لیے بچوں کے عام اور گھسے پٹے کھیل کبھی نا بھائے۔ محلے کے سارے معمولی قسم کے بچوں کے ہم آئیڈیل تھے۔ ہمارے بولنے اور کھیلنے کی کاپی کر کے انھیں دلی مسرت ہوتی تھی ادھر ہم ہی کہ بڑے فنکاروں کے انداز میں اسکیچ بنانے کے مقابلے کر رہے ہیں کبھی پینٹنگ کی نمائش ہو رہی ہے میوزک کنسرٹ منعقد کیے جا رہے ہیں فلمی رسالے اور اخبار شائع ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کے پول کھولے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مشاعرے ہوتے، اسٹیج ڈرامے منعقد کیے جاتے۔ شاید اسی ماحول کا اثر ہے کہ ہم سب بڑے ہو کر بھی کسی نا کسی آرٹ کے پیچھے پڑ گئے۔ کوئی آرٹیسٹ بنا، کوئی فوٹو گرافر، کوئی شاعر کوئی افسانہ نگار مگر سب کو اپنے اصول ابھی تک بہت پیارے ہیں آدرش کو کلیجے سے لگائے جی رہے ہیں۔"(1)

جیلانی بانو فطرتاً ایک تخلیق کار پیدا ہوئی تھیں انھوں نے جو افسانے اور ناول لکھے وہ اس بات کا بہترین ثبوت ہے۔ اپنے وطن سے محبت کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اگرچہ انھوں نے تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان میں سکونت اختیار کی لیکن ان کی حیدر آباد کی زمین سے وابستہ یادیں اور گہرے جذبات ہمیشہ ان کی کہانیوں میں اس مٹی کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ جیلانی بانو کا پہلا افسانوی مجموعہ روشنی کے مینار 1958 میں شائع ہوا اور دوسرا افسانوی مجموعہ نروان 1964 میں شائع ہوا۔

جگنو اور ستارے جس میں تین ناولٹ شامل ہیں 1965 میں شائع ہوا جیلانی بانو نے ناول نگاری کی طرف بہت دیر سے توجہ کی اور ان کا پہلا ناول 1976 میں ایوان غزل شائع ہوا دوسرا ناول 1985 میں بارش سنگ شائع ہوا۔ جیلانی بانو کے ناول ہندوستان کی سب سے اہم ریاستوں میں سے ایک ریاست حیدر آباد کی سرزمین کے پس منظر میں لکھے گئے۔ حیدر آباد کی تہذیب اور ثقافت صدیوں سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ انیس سو سینتالیس سے قبل یہ ریاست ہندوستان کی چند امیر ترین ریاستوں میں سے ایک تھی۔ اس کی صدیوں پر محیط الگ شناخت ایک سنہری دور سے گزر کر زوال آمادہ تھی حکمران طبقہ عیش و عشرت اور اقربا پروری کا شکار تھا عوام کا استحصال ذاتی مفادات کیلیے رعایا کے وسائل اور افرادی قوت کا استعمال معمول تھا جس کے نتیجے میں عوام اور حکمران طبقہ کے درمیان خلیج پیدا ہوئی جیلانی بانو کے ناولوں میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ریاست حیدر آباد کے تمام طبقوں کی زندگی سیاسی، سماجی، تہذیبی، بحران اور نفسیاتی مسائل کی پوری تصویر نظر آتی ہے۔ ان ناولوں کی مدد سے نا صرف ریاست حیدر آباد بلکہ

پورے ہندوستان کے جاگیر ادارانہ کلچر کے نفسیاتی مسائل کو سمجھا جا سکتا۔ جیلانی بانو اس ناول کے لکھنے کی تحریک اور مقصد کی طرف متوجہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''جب میں نے یہ ناول لکھنا شروع کیا تو میرے سامنے کوئی پلاٹ تھا، نا کوئی کردار۔ اور نا ہی میں نے کوئی مخصوص تکنیک اپنے سامنے رکھی، اس کے باوجود بھی میں اس ناول کو لکھنے کیلیے بے چین تھی۔ اس ناول کے تمام کردار اپنے ماحول کی علامت ہیں خاص طور پر نسوانی کردار۔''(2)

ناول ایوان غزل ناولستان جامعہ نگر دہلی سے پہلی بار 1976 میں شائع ہوا تب تقسیم ہند اور سقوط حیدر آباد کو لگ بھگ تین دہائیاں گذر چکی تھیں لیکن انھوں نے جس طرح موضوع پر گرفت اور موئثر نقطہ نظر کی جھلک پیش کی اس وجہ سے جیلانی بانو کے یہ دونوں ناول اردو ناول نگاری کی تاریخ کے چند اہم ترین ناولوں میں سے ایک ناول کے طور پر ان کی شہرت کا باعث بنا۔ اس ناول کی بہت زیادہ تعریف کی گئی۔ جہاں بہت سے لوگوں نے اس ناول کو سراہا وہاں اعتراضات بھی اٹھائے گئے۔ جس کی ایک مثال عشرت چغتائی کا یہ بیان ہے:

> ''جس طبقے پر یہ ناول لکھا گیا ہے وہ مر چکا۔ اب تو جاگیر دار بھی بڑی سوجھ بوجھ کے مالک نظر آتے ہیں اس مرے ہوئے طبقے کی حماقتوں کی یاد تازہ کرنا کیا ضروری ہے۔''(3)

دراصل ہندوستان میں جاگیر داری نظام کے خاتمے کیلیے تقسیم کے بعد عملی اقدامات ہوئے بھارت میں اس نظام کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جاگیر طبقہ پاکستان اور بھارت میں تقسیم کے بعد نئے انداز اور نئے روپ میں اب تک وسائل پر قابض ہے اگسر شاہی، موروثی سیاست اور سرمایہ دار بن کر اس طبقہ نے نو آبادیاتی عہد کی ذہنیت کو استعمال کرتے ہوئے استحصالی نظام کے نئے انداز اختیار کرتے ہوئے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے یہی وہ نقطہ نظر ہے جس کو سامنے رکھتے ہوئے جیلانی بانو نے یہ ناول تخلیق کیے۔ ان ناولوں کی عملی افادیت اور اطلاقی پہلو آج بھی کارآمد ہیں ۔

جیلانی بانو کے ناول ایوانِ غزل کو جب ایک مربوط نفسیاتی، سماجی اور سیاسی متن کے طور پر پڑھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ محض ایک کہانی نہیں بلکہ طاقت، جبر اور انسانی باطن کی پیچیدہ ساختوں کا گہرا مطالعہ ہے۔ اس بیانیے میں جاگیر دارانہ نظام اپنی مکمل سفاکی کے ساتھ موجود ہے، جہاں طاقت کا استعمال نہ صرف سماجی و معاشی سطح پر ہوتا ہے

بلکہ جنس، جذبات اور ذہن تک سرایت کر جاتا ہے۔ یہ نظام عورت کے وجود کو محدود، کنٹرول اور مسخ کر کے اسے ایک ایسی داخلی قید میں مبتلا کرتا ہے جہاں اس کی آواز، خواہش اور شناخت سب کچھ دبا دیا جاتا ہے۔

ناول میں پیش کیا گیا "ایوان" بظاہر تہذیب، شائستگی اور ادبی ذوق کی علامت ہے، مگر اس کے اندر ایک متوازی حقیقت پوشیدہ ہے۔ یہی ایوان، جو شعر و ادب کی قدر کا دعویدار ہے، دراصل طاقت کے ایک خفیہ مرکز میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں عورت کے جسم اور اس کے احساسات پر غیر اعلانیہ قبضہ قائم کیا جاتا ہے۔ "غزل" جو لطافت، جمال اور احساس کی نمائندہ ہے، اسی ایوان میں ایک ایسی شے بن کر رہ جاتی ہے جس کے فن کو سراہا جاتا ہے مگر اس کی ذات کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس تضاد میں ایک گہری نفسیاتی سچائی پوشیدہ ہے: ثقافتی بالادستی اکثر استحصال کو جمالیاتی پردے میں چھپا دیتی ہے۔

غزل کا کردار اس پورے نظام کی سب سے بامعنی علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ وہ ایک حساس، باوقار اور فنکارانہ مزاج رکھنے والی عورت ہے، مگر اس کے باطن میں شدید کرب اور شکستگی موجود ہے۔ اس کے وجود میں جو ٹھہراؤ اور خاموشی دکھائی دیتی ہے، وہ دراصل ایک دفاعی حکمتِ عملی ہے—ایک ایسا نفسیاتی میکانزم جس کے ذریعے وہ اپنے زخموں کو چھپاتی ہے۔ اس کے اندر دبی ہوئی خواہشات، نامکمل محبت، اور جسمانی و جذباتی استحصال کے تجربات مل کر ایک پیچیدہ داخلی کشمکش پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے درد کو براہِ راست بیان نہیں کر سکتی، اس لیے وہ اسے اپنے رویوں، اپنی خاموشی اور اپنے فن میں منتقل کر دیتی ہے۔ یہی عمل نفسیاتی اصطلاح میں Sublimation کہلاتا ہے، مگر یہاں یہ تخلیقی اظہار بھی مکمل تسکین فراہم نہیں کر پاتا کیونکہ استحصال کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ڈاکٹر فیضان حسن ضیائی غزل کی نفسیات پہ لکھتے ہیں:

> "غزل کا کردار چاند کی بہ نسبت زیادہ پیچیدہ اور مبہم ہے۔ چونکہ غزل کا بچپن چاند کے برعکس فرسودہ ماحول میں گزرتا ہے۔ اور اس کا تعلق بیک وقت الف لیلی اور ایوان غزل کے ماحول سے بھی رہا ہے۔ لیکن دونوں ہی جگہ اس کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں رہی جہاں وہ ایک طرف اپنی ماں کی بے وقت موت کا صدمہ لیے پھرتی ہے وہیں باپ کی بے حسی اور نفرت کا شکار ہے اور اس کے ماموں راشد کا ایک ناپاک ذہن ہے جو اسے ذخیرہ اندوزی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ ایک مرتبہ چاند نے غزل کو نصیحت کرتے ہوئے بہت سہی بات کہی

تھی۔"(4)

نواب سرفراز علی خان، سلیم احمد اور کامران جیسے مرد کردار اس جابرانہ نظام کے مختلف چہرے ہیں۔ نواب سرفراز علی خان کے کردار میں طاقت کا کھلا اور بے رحم استعمال نظر آتا ہے۔ وہ عورت کو اپنی ملکیت اور کسان کو اپنی پیداوار کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کی نفسیات میں ایک سخت گیر برتری کا احساس موجود ہے، جو اسے دوسروں کے وجود کو محض وسائل تک محدود کر دینے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے زیرِ اثر عورت کی حیثیت ایک ایسی شے کی بن جاتی ہے جسے قابو میں رکھنا ضروری ہے، اور یہی کنٹرول اکثر جنسی جبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ جبر محض جسمانی نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی سطح پر بھی عورت کو توڑ دیتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنی خواہشات سے خود ہی دستبردار ہونے لگتی ہے۔

سلیم احمد کا کردار ایک زیادہ پیچیدہ اور خطرناک نفسیاتی صورت پیش کرتا ہے۔ وہ بظاہر مہذب اور شائستہ ہے، مگر اس کی شائستگی دراصل ایک پردہ ہے جس کے پیچھے جذباتی استحصال چھپا ہوا ہے۔ وہ عورت کو براہِ راست دبانے کے بجائے محبت، توجہ اور قربت کے ذریعے اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ نجمہ کے ساتھ اس کا تعلق اس بات کی واضح مثال ہے کہ کس طرح جذباتی وابستگی کو طاقت کے ایک نفیس آلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کی نفسیات میں کنٹرول کا ایک ایسا رجحان موجود ہے جو عورت کو اپنی مرضی سے جینے کا موقع نہیں دیتا بلکہ اسے ایک ایسے تعلق میں باندھ دیتا ہے جہاں اس کی آزادی محض ایک وہم رہ جاتی ہے۔

کامران کا کردار زوال اور داخلی خلا کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے اندر کوئی واضح اخلاقی مرکز موجود نہیں، اور وہ اپنی خواہشات کے تابع زندگی گزارتا ہے۔ اس کے نزدیک عورت ایک وقتی تسکین کا ذریعہ ہے، جس کے نتیجے میں سلمیٰ جیسے کردار شدید وجودی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کامران کی نفسیات میں جو خلا ہے، وہ دراصل ایک ایسے نظام کی پیداوار ہے جہاں اقدار بکھر چکی ہیں اور انسان اپنی داخلی معنویت کھو چکا ہے۔ وہ اس خلا کو وقتی لذتوں سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر یہ کوشش نہ صرف ناکام رہتی ہے بلکہ دوسروں کی زندگیوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

ان مرد کرداروں کے زیرِ اثر خواتین کی حالت زار ایک مشترک مگر متنوع نفسیاتی تجربہ بن کر سامنے آتی ہے۔ چار دیواری کے اندر عورت کی زندگی بظاہر محفوظ نظر آتی ہے، مگر درحقیقت یہی جگہ اس کے لیے سب سے بڑی قید بن جاتی ہے۔ یہاں اس کی آواز محدود، اس کی خواہشات مشکوک، اور اس کی شناخت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی

ہے۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی، اور اگر کرتی ہے تو اسے دبایا جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ ایک ایسے نفسیاتی دائرے میں قید ہو جاتی ہے جہاں خاموشی، برداشت اور داخلی کرب اس کی پہچان بن جاتے ہیں۔

جنسی اور جذباتی استحصال کے یہ تجربات عورت کی نفسیات میں گہرے زخم چھوڑتے ہیں۔ وہ خود کو کمتر سمجھنے لگتی ہے، اس کی خود اعتمادی متاثر ہوتی ہے، اور وہ اپنی شناخت کے بحران میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت صرف فردی سطح پر نہیں رہتی بلکہ ایک اجتماعی تجربہ بن جاتی ہے، جہاں ہر عورت کسی نہ کسی درجے میں اسی جبر کا شکار نظر آتی ہے۔ غزل، نجمہ اور سلمیٰ کی مختلف نفسیاتی کیفیات دراصل اسی ایک نظام کے مختلف ردِ عمل ہیں—خاموش بغاوت، جذباتی وابستگی، اور مکمل داخلی شکست۔ اس ردعمل کو طحنم دیتی ہے جس میں یہ مظلوم عورت بغاوت پر اترتی ہے تو یوں تلخ انداز میں ردعمل ظاہر کرتی ہے کہ پورے نظام سے بغاوت کرنے لگتی ہے:

> ''تمہاری شاعری کی ایسی کی تیسی۔ اس ایوان غزل پر مٹی ڈالو جہاں عورت کو لوٹ کھسوٹ کر چھوڑ دیتے ہیں۔''(5)

اسی نظام کا ایک اہم پہلو کسانوں کا استحصال بھی ہے، جو اس ناول میں ایک پس منظر کے طور پر موجود ہونے کے باوجود گہری معنویت رکھتا ہے۔ جاگیر دار مرد کسانوں کی محنت کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں، انہیں قرض اور محتاجی کے دائرے میں رکھتے ہیں، اور ان کی زندگی کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ استحصال صرف معاشی نہیں بلکہ نفسیاتی بھی ہے، کیونکہ مسلسل دباؤ اور بے بسی کسانوں میں ایک ایسا رویہ پیدا کر دیتی ہے جسے Learned Helplessness کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ تبدیلی ممکن نہیں۔

''ایوانِ غزل'' اس طرح ایک ایسا علامتی اور نفسیاتی منظر نامہ بن جاتا ہے جہاں طاقت کا ہر مظہر چاہے وہ جنسی ہو، جذباتی ہو، سماجی ہو یا سیاسی انسانی وجود کو محدود کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس ایوان کے اندر شعر و ادب کی قدر کا جو پردہ موجود ہے، وہ دراصل استحصال کو چھپانے کا ایک مہذب ذریعہ بن جاتا ہے۔ غزل اور اس جیسی دیگر خواتین اس پردے کے پیچھے اپنے وجود کی قیمت ادا کرتی ہیں، جہاں ان کا فن تو سراہا جاتا ہے مگر ان کی ذات مسلسل نظر انداز اور مجروح ہوتی رہتی ہے۔ یہ ناول اس بنیادی سچائی کو بے نقاب کرتا ہے کہ جب طاقت غیر متوازن ہو جائے تو وہ صرف جسموں پر نہیں بلکہ ذہنوں اور روحوں پر بھی قبضہ جما لیتی ہے۔ عورت کی خاموشی، اس کی شکستگی، اور اس کی

اندرونی بغاوت دراصل اسی قبضے کے خلاف ایک غیر مرئی مزاحمت ہے، جو بظاہر نظر نہیں آتی مگر اپنی معنویت میں نہایت گہری اور اثر انگیز ہے۔

جیلانی بانو کا ناول ''بارشِ سنگ'' اردو فکشن میں ایک ایسی اہم اور معنی خیز تخلیق ہے جو اپنے عہد کے سماجی، معاشی اور نفسیاتی بحرانوں کو نہایت گہرائی اور وسعت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ ناول اپنے بیانیے، کرداروں اور علامتی نظام کے ذریعے ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں طاقت، جبر اور استحصال نے انسانی زندگی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ 1985 میں شائع ہونے والا یہ ناول اپنے پیش رو ناول کا تسلسل ہونے کے ساتھ ساتھ موضوعاتی اعتبار سے زیادہ پختہ، زیادہ تلخ اور زیادہ حقیقت پسندانہ ہے مشرف علی اس ناول کا تعارف کرواتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''جیلانی بانو کا دوسرا ناول بارش سنگ ایک سماجی ناول ہے جسے تلنگانہ تحریک کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں ریاست حیدر آباد کے دیہی علاقوں میں رہنے والے غریب کسانوں مزدوروں اور عورتوں کی روزمرہ زندگی اور ان کے حالات و مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں سماجی نابرابری جاگیر دارانہ نظام کا ظلم و ستم اور طبقاتی کشمکش کو پوری شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے کہ جاگیر دارانہ نظام کے سماجی و سیاسی ڈھانچے کی حقیقی تصویر اجاگر ہوتی ہے۔''(6)

ناول کا آغاز ''چیکٹ پلی'' نامی گاؤں سے ہوتا ہے، جس کا مفہوم "اندھیر نگری" ہے۔ یہ نام محض ایک جغرافیائی شناخت نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی اور سماجی علامت ہے۔ مشرف علی کے الفاظ میں:

> ''چیکٹ پلی اس عہد کے ہندوستان کا کوئی بھی گاؤں ہو سکتا ہے کرداروں کے نام بدل سکتے ہیں لیکن مسائل سب جگہ یکساں ہیں اور ظلم و ستم اور سماجی استحصال سے تڑپتی بلکتی عوام ان مسائل کے حل کیلیے ہمہ وقت کوشاں رہتی ہے اور آخر کار استحصالی قوتوں کی سیاسی چالوں کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے۔''(7)

چیکٹ پلی کی فضا میں ہر طرف ایک ایسا اندھیرا پھیلا ہوا ہے جو صرف روشنی کی عدم موجودگی نہیں بلکہ انصاف، اخلاق اور انسانی قدروں کے فقدان کی علامت ہے۔ یہاں قانون کا کوئی واضح تصور موجود نہیں، اور اگر ہے بھی تو وہ طاقتور طبقے کے مفادات کے تابع ہے۔ گاؤں کے کمزور اور غریب لوگ ایک ایسے نظام میں سانس لے رہے

ہیں جہاں ان کی حیثیت محض مزدور یا غلام سے زیادہ نہیں۔ جاگیر دار خود حکومت بھی ہیں اور قانون بھی حکومت کے قانون کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا قانون بھی چلتا ہے اس کے مطابق وہ لوگوں کو سخت سزائیں دیتے ہیں اور ان کی آواز دبا کر رکھتے ہیں۔ ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''گاؤں میں صرف سرکار کا حکم نہیں چلتا بلکہ گاؤں والوں کے اپنے بھی قانون ہیں جنھیں توڑنے کی کسی میں بھی ہمت نہیں ہے۔ کوئی سرکاری قانون توڑے تو اکیلا جیل چلا جائے گا مگر گاؤں کا قانون توڑنے والے کی آنے والی سات نسلیں اس جرم کی سزا بھگتتی ہیں۔''(8)

اس گاؤں اور اس کے گرد و نواح کے دیہاتوں میں جاگیر دار اور ساہوکار طبقہ ایک مضبوط اور منظم قوت کے طور پر موجود ہے۔ یہ طبقہ نہ صرف زمین اور وسائل پر قابض ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اپنا اختیار قائم رکھتا ہے۔ وینکٹ ریڈی کا کردار اسی طبقے کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی شخصیت میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک استحصالی جاگیر دار میں پائے جاتے ہیں: بے رحمی، خود غرضی، طاقت کا نشہ اور اخلاقی انحطاط۔ وہ کسانوں کو قرض دے کر انہیں اپنے شکنجے میں جکڑتا ہے اور پھر سود کے نام پر ان کی محنت کا استحصال کرتا ہے۔ ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ہر سال جب سوکھا پڑتا تو گاؤں والوں کے زیور اور برتن اس کے پاس رہن کیلیے آجاتے اور دو چار ایکڑ زمین وہ اور خرید لیتا تین چار کھیت مزدوروں کو رہن رکھ لیتا جوار چاول گنا اجوائن ہر چیز کی فصل اس کے کھیتوں میں لہلہا کر آتی تھی۔ جب آتا اور گنے کی فصل آتی اس کے دوست شہر سے آکر پکنک مناتے اس کے دوست کھیتوں اور باغوں میں گھوم گھوم کر پکے پکے پھل اور کچی کچی لڑکیاں تاکتے تھے۔ کبھی یہ لڑکیاں زور زبردستی سے لائی جاتی تھیں کبھی پانچ دس روپے پر بات ہو جاتی تھی۔''(9)

یہ استحصال وقتی نہیں بلکہ نسلی ہے، یعنی ایک نسل کے بعد دوسری نسل بھی اسی غلامی میں جکڑی رہتی ہے۔

مستان کا کردار ایک ایسے کسان کی تصویر پیش کرتا ہے جو اس استحصالی نظام کا براہ راست شکار ہے۔ اس کی زندگی مسلسل محنت، محرومی اور ذلت سے عبارت ہے۔ وہ اپنی محنت کے باوجود اپنے حالات کو بدلنے سے قاصر ہے کیونکہ نظام اس کے خلاف ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کی بے بسی اس وقت مزید گہری ہو جاتی ہے جب اس کی بیٹی بھی اسی نظام کا شکار بن جاتی ہے۔ یہاں ناول ایک نہایت حساس اور سنگین پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں معاشی استحصال

کے ساتھ ساتھ جنسی جبر بھی اپنی انتہائی شکل میں موجود ہے۔

سلیم کا کردار ایک ایسے حساس اور شعور یافتہ فرد کی نمائندگی کرتا ہے جس کے اندر بچپن ہی سے حق و باطل کی تمیز موجود ہے۔ وہ ایسی نفسیاتی کشمکش کا مظہر ہے جو جبر کے ماحول میں پلنے والے باشعور انسان کے اندر جنم لیتی ہے۔ اس کی شخصیت میں بغاوت، خوف، معصومیت اور داخلی اضطراب بیک وقت موجود ہیں جو اسے ناول کے دیگر کرداروں سے ممتاز بناتے ہیں۔ سلیم دراصل اس طبقے کی علامت ہے جو ظلم کو محسوس تو کرتا ہے مگر حالات کے جبر کے باعث کھل کر اس کے خلاف کھڑا نہیں ہو پاتا۔ اس کی ذات ایک مسلسل ذہنی اور جذباتی کشمکش کا شکار رہتی ہے۔ مشرف علی لکھتے ہیں:

> ''سلیم اس ناول کا اہم کردار ہے۔ وہ مستان کا لڑکا ہے اور بچپن سے ہی باغی جذبہ رکھتا ہے۔ اپنے گھر والوں کے برعکس وہ وینکٹ ریڈی کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اس کا معصوم ذہن بچپن سے ہی جبر و ظلم کے خلاف آواز اٹھانا چاہتا ہے لیکن اس کے گھر والے بغاوت کے انجام سے ڈراتے دھمکاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ذہنی گھٹن کا شکار رہتا ہے۔''(10)

نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سلیم ایک ایسے بچے کی تصویر پیش کرتا ہے جو شدید داخلی تضاد (inner conflict) کا شکار ہے۔ ایک طرف اس کے اندر فطری انصاف پسندی اور بغاوت کا جذبہ موجود ہے جبکہ دوسری طرف خاندانی دباؤ اور خوف اس کے اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تضاد اس کے اندر ذہنی گھٹن (mental suffocation) اور اضطراب کو جنم دیتا ہے۔ اس کی شخصیت میں دباؤ کے تحت تشکیل پانے والی خاموش بغاوت نمایاں ہے، جو اکثر ایسے بچوں میں پیدا ہوتی ہے جو جبر کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں۔

سلیم کا معصوم ذہن دراصل ایک غیر آلودہ شعور کی نمائندگی کرتا ہے، جو معاشرتی ناانصافی کو فطری طور پر رد کرتا ہے۔ لیکن جب اس کے جذبات کو بار بار دبایا جاتا ہے تو اس کے اندر احساسِ محرومی، خوف اور بے بسی جنم لیتے ہیں۔ یہ کیفیت نفسیات میں repression (دباؤ) کہلاتی ہے جہاں انسان اپنے فطری جذبات کو حالات کے تحت دبا دیتا ہے۔

وینکٹ ریڈی کا مستان کی بیٹی پر تشدد ایک ایسا واقعہ ہے جو پورے ناول کی فضا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ واقعہ محض ایک فرد کا جرم نہیں بلکہ ایک ایسے نظام کی عکاسی کرتا ہے جہاں طاقتور کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے اور

کمزور کے پاس مزاحمت کا کوئی مؤثر ذریعہ نہیں۔اسی طرح رنگا ریڈی کا قتل اور اس کی بیوی کا اغوا اس حقیقت کو مزید واضح کرتا ہے کہ جاگیر دارانہ نظام میں انسانی جان اور عزت کی کوئی قیمت نہیں۔عورت یہاں دوہری مظلومیت کا شکار ہے:ایک طرف وہ طبقاتی جبر کا نشانہ ہے اور دوسری طرف صنفی استحصال کا۔

حویلی کی عورتیں بھی بظاہر طاقت کے مرکز میں رہتے ہوئے جبر کا شکار ہیں۔ان کی زندگی بظاہر آسائشوں سے بھرپور دکھائی دیتی ہے، مگر درحقیقت وہ ایک قید میں رہ رہی ہیں جہاں ان کی آزادی، خواہشات اور شناخت سب کچھ محدود ہے۔اس طرح ناول یہ واضح کرتا ہے کہ استحصال صرف نچلے طبقے تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک ہمہ گیر نظام ہے جو مختلف سطحوں پر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

اردو ناول میں جاگیر دارانہ نظام اور اس کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی شخصی نفسیات ایک نہایت اہم موضوع رہا ہے۔ایسے کردار پورے استحصالی معاشرے کی ذہنی ساخت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ملیشم ریڈی کا کردار بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو طاقت اور سماجی برتری کے زعم میں مبتلا ایک ایسے انسان کی تصویر پیش کرتا ہے جس کی نفسیاتی ساخت ظلم، ہوس اور خود غرضی کے عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔اس کردار کے ذریعے مصنفہ نے جاگیر دارانہ ذہنیت کو اجاگر کیا ہے۔اس کے باطن میں چھپے ہوئے احساسِ برتری، عدم تحفظ اور حیوانی جبلتوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔

ناول میں ملیشیم ریڈی کا کردار ایک اہم فکری اور نظریاتی جہت فراہم کرتا ہے۔وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو حالات کا شعور رکھتا ہے اور ظلم کے خلاف ایک داخلی مزاحمت بھی رکھتا ہے۔وہ اس نظام کو غلط سمجھتا ہے اور اس کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش بھی کرتا ہے، مگر اس کی کوششیں زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوتیں۔اس کی بے بسی دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فرد کی سطح پر شعور اور مزاحمت اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک وہ اجتماعی شعور اور منظم تحریک میں تبدیل نہ ہو۔اس کردار کی نفسیات کو مشرف علی نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ”ملیشم ریڈی گاؤں کے ساہوکاروں اور مہاجنوں کی نمائندگی کرتا ہے۔وہ وینکٹ ریڈی کا چھوٹا بھائی ہے اور شہر میں وکالت کرتا ہے لیکن وینکٹ ریڈی کے قتل کے بعد وہ گاؤں آجاتا ہے اور زمین وجائیداد کی دیکھ بھال کرتا ہے۔وہ اپنے بھائی سے زیادہ ظالم اور عیش پرست ہے۔یہاں تک کہ وہ اپنی بیوہ بھابھی رتنا پر بھی بری نظر رکھتا ہے اور زبردستی اس سے اپنی جنسی ہوس پوری کرتا ہے۔تلنگانہ کے چھاپہ مار دستوں کے ڈر سے وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ شہر چلا جاتا ہے اور

کبھی کبھار گاؤں آ کر زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ وقت کی نبض کو پہچانتے ہوئے کانگریس میں شامل ہو جاتا ہے اور حکومت میں وزیر بھی بن جاتا ہے۔ اس طرح آزاد ہندوستان میں بھی وہ غریب کسانوں اور مزدوروں کا استحصال جاری رکھتا ہے۔"(11)

ملیشم ریڈی کا کردار ایک پیچیدہ نفسیاتی ساخت کا حامل ہے جس میں احساسِ برتری (Superiority Complex) اور احساسِ عدم تحفظ (Insecurity) بیک وقت موجود ہیں۔ بظاہر وہ ایک طاقتور، بااثر اور خود اعتماد انسان نظر آتا ہے، مگر اس کے اعمال اس کے اندر چھپے خوف اور عدمِ تحفظ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اپنے بھائی سے بڑھ کر ظلم کرنا دراصل اس کی اس نفسیاتی خواہش کا اظہار ہے کہ وہ خود کو زیادہ طاقتور اور غالب ثابت کرے۔ اس کے کردار میں جنسی استحصال کا پہلو اس کی دبی ہوئی حیوانی جبلتوں اور اخلاقی زوال کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنی بیوہ بھابھی پر ظلم کرنا نہ صرف اس کی اخلاقی پستی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ یہ اس کے اندر موجود طاقت کے غلط استعمال کی انتہا کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ عمل اس کے اندر موجود اقتدار کی ہوس اور تسلط کی خواہش کا عکاس ہے۔

مجموعی طور پر ملیشم ریڈی ایک ایسے استحصالی، خود غرض اور موقع پرست انسان کی نفسیاتی تصویر ہے جس کی شخصیت میں طاقت کی ہوس، اخلاقی زوال، اور اندرونی خوف ایک ساتھ موجود ہیں۔ یہ کردار اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ معاشرتی استحصال دراصل فرد کی بگڑی ہوئی نفسیات کا مظہر ہوتا ہے، جو حالات کے بدلنے کے باوجود اپنی اصل شکل برقرار رکھتی ہے۔

ناول کا سب سے اہم اور گہرا پہلو مظلوم طبقے کے اندر پنپنے والا نفسیاتی دباؤ ہے۔ ابتدا میں یہ دباؤ خاموشی اور برداشت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لوگ ظلم سہتے رہتے ہیں، اپنے دکھ کو اندر ہی اندر دباتے رہتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہی دباؤ غم، غصے اور اضطراب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت ایک ایسے مقام تک پہنچ جاتی ہے جہاں انسان کے لیے خاموش رہنا ممکن نہیں رہتا۔ چنانچہ یہی دباؤ ایک اجتماعی بغاوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

یہ بغاوت اچانک نہیں ہوتی بلکہ ایک تدریجی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب انسان مسلسل ذلت، محرومی اور جبر کا شکار رہے تو اس کے اندر ایک ایسا لاوا جمع ہونے لگتا ہے جو کسی نہ کسی وقت پھٹنا ہی ہوتا ہے۔ ناول میں یہی لاوا قتل و غارت کی صورت میں پھٹتا ہے۔ یہ منظر نامہ اگرچہ پر تشدد ہے، مگر اس کے پیچھے ایک گہری نفسیاتی اور سماجی منطق

موجود ہے۔ یہ بغاوت دراصل ایک ایسے نظام کے خلاف احتجاج ہے جو انسان کو اس کی بنیادی انسانی حیثیت سے محروم کر دیتا ہے۔

ناول کا ایک اور اہم پہلو تقسیمِ ہند کے بعد کے حالات کی عکاسی ہے۔ بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جاگیر دارانہ نظام ختم ہو گیا، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوا۔ وہی جاگیر دار نئی سیاسی اور معاشی ساختوں میں خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ وہ اسمبلی کے ممبر بن جاتے ہیں، سرمایہ دار بن جاتے ہیں اور اپنے استحصالی ہتھکنڈوں کو ایک نئے انداز میں جاری رکھتے ہیں۔ اس طرح استحصال کا نظام ختم ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ اور مضبوط ہو جاتا ہے کیونکہ اب اسے قانونی اور سیاسی تحفظ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

علامتی اعتبار سے ''بارشِ سنگ'' کا عنوان نہایت معنی خیز ہے۔ بارش عام طور پر زندگی، تازگی اور رحمت کی علامت ہوتی ہے، مگر یہاں اس کے ساتھ "سنگ" کا اضافہ ایک شدید تضاد پیدا کرتا ہے۔ یہ تضاد دراصل اس معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جہاں زندگی کے بجائے موت، امید کے بجائے مایوسی اور رحمت کے بجائے عذاب برس رہا ہے۔ یہ عنوان پورے ناول کی فضا اور اس کے مرکزی خیال کو نہایت جامع انداز میں پیش کرتا ہے۔

اسلوب کے لحاظ سے جیلانی بانو نے حقیقت نگاری کو ایک فنی کمال کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی زبان سادہ مگر پر اثر ہے، اور ان کا بیانیہ اس قدر جاندار ہے کہ قاری خود کو کہانی کے اندر محسوس کرتا ہے۔ جزئیات نگاری نہایت باریک ہے؛ چھوٹے چھوٹے مناظر، کرداروں کے رویے، ان کے جذبات اور ان کے باطنی احساسات اس مہارت سے بیان کیے گئے ہیں کہ ایک مکمل اور جیتی جاگتی دنیا قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔ مصنفہ نے نہ صرف خارجی حالات کو بیان کیا ہے بلکہ کرداروں کی داخلی کیفیت کو بھی نہایت گہرائی سے پیش کیا ہے، جس سے ناول کی نفسیاتی جہت مزید مضبوط ہو جاتی ہے۔

مجموعی طور پر بارشِ سنگ ایک ایسی تخلیق ہے جو جاگیر دارانہ نظام کے جبر، انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں، طبقاتی کشمکش اور سماجی ناانصافیوں کو ایک جامع اور مربوط انداز میں پیش کرتی ہے۔ یہ ناول قاری کو صرف ایک کہانی نہیں سناتا بلکہ اسے ایک ایسے معاشرتی نظام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے جو بظاہر بدل چکا ہے مگر اپنی اصل روح میں آج بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ جیلانی بانو نے اس ناول کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ ادب نہ صرف حقیقت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اسے سمجھنے اور بدلنے کا شعور بھی فراہم کرتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ جیلانی بانو، نقوش آپ بیتی نمبر (لاہور: ادارہ فروغِ اردو، 1964ء)، ص1289
2۔ جیلانی بانو، سالنامہ شعری ادب (انٹرویو)، (شمارہ نمبر 29، 30، 1977ء)، ص17
3۔ عصمت چغتائی (مضمون نگار)، مشمولہ: سہ نامہ گفتگو (دسمبر 1976ء)، ص279
4۔ فیضان حسن ضیائی، ڈاکٹر، ناول "ایوان غزل" کے اہم کردار: ایک تجزیاتی مطالعہ (ادبی میراث، 4 اگست 2022ء)
https://adbimiras.com/novel-aiwan-e-ghazal-ke-aham-kirdar-/aik-tajziyati-mutaliah-by-faizan-hasan-ziyai
5۔ جیلانی بانو، ایوانِ غزل (نئی دہلی: ناولستان جامعہ نگر، 1996ء)، ص440
6۔ مشرف علی، جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2003ء)، ص51
7۔ ایضاً، ص108
8۔ جیلانی بانو، بارشِ سنگ (حیدر آباد: اردو مرکز، 1985ء)، ص45
9۔ ایضاً، ص38
10۔ مشرف علی، جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، ص132
11۔ ایضاً، ص139، 140